دستورِ پاکستان کی آئینی، اخلاقی، اسلامی اور جمہوری حیثیت

(مندرجۂ ذیل تقریر مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی، امیر جماعت اسلامی، پاکستان نے ۱۰ مارچ کو لاہور ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن کے ایک اجتماع میں ارشاد فرمائی)

حضرات! کسی دستور پر گفتگو کرنے کے لیے یہ بات کافی نہیں ہے کہ ہم محض اس کی دستاویز ہاتھ میں لے کر اس پر بحث شروع کر دیں۔ پہلے ہمیں اس کا تاریخی پس منظر دیکھنا چاہیے کہ وہ کس ملک میں کیسے حالات میں کس طرح بنا۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی دیکھنا ضروری ہے کہ اس دستور کے پیچھے کوئی اخلاقی جواز بھی موجود ہے یا نہیں۔ کوئی قانون یا دستور جس کی پشت پر اخلاق کی طاقت نہ ہو اگر محض سیاسی طاقت سے نافذ ہو بھی جائے تو انسانی ضمیر پر اس کی گرفت قائم نہیں ہو سکتی۔

ان دو امور کو پیشِ نظر رکھ کر جب ہم دستور کے مسئلہ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو یہ حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے کہ پاکستان کا ایک آزاد اور خود مختار مملکت کی حیثیت سے وجود میں آنا کسی فرد واحد یا کسی خاص گروہ کی کوششوں کا نتیجہ نہیں ہے۔ دراصل متحدہ ہندوستان کی پوری مسلم قوم نے اس کے لیے جدوجہد کی، قربانیاں دیں اور بالآخر سلطنتِ برطانیہ کو اس بات پر مجبور کر دیا کہ جو حاکمیت (SOVEREIGNTY) اُسے حاصل ہے اس سے وہ دستبردار ہو جائے۔ یہ دستبرداری برٹش پارلیمنٹ نے ایک باقاعدہ قانون کی شکل میں لکھ دی جسے انڈین انڈی پنڈنس ایکٹ (قانونِ آزادیٔ ہند) کے نام سے دنیا جانتی ہے۔ اس ایکٹ کی رُو سے سلطنتِ برطانیہ کسی شخص یا گروہ کے حق میں دستبردار نہیں ہوئی تھی بلکہ باشندگانِ پاکستان کے حق میں دستبردار ہوئی تھی اور اس نے باشندوں کے نمائندوں پر مشتمل مجلسِ دستور ساز کو اس حاکمیت کا امین بنایا تھا۔ یہ ایک فطری اصول ہے کہ کسی صاحبِ حاکمیت طاقت کو جس نے حاکمیت سے دست بردار ہونے پر مجبور کیا ہو وہی اس حاکمیت کا حقدار ہوتا ہے اور کسی دوسرے کو اسے بیچ میں

اُچک لینے کا حق نہیں ہوتا۔ برطانوی سلطنت سے اس حاکمیت کو کسی شخص کی طرف منتقل کرنا کسی درجے میں بھی صحیح ہو سکتا تھا تو وہ شخص قائداعظم مرحوم ہو سکتے تھے جن کی قیادت میں پاکستان کی جنگ لڑی گئی تھی۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ یہ حاکمیت ان کی طرف بھی منتقل نہیں ہوئی تھی بلکہ خود اُنہوں نے اسے باشندوں کی طرف منتقل کرایا تھا۔ اس لیے اصولاً باشندگانِ پاکستان کی نمائندہ مجلسِ دستور ساز ہی اس ملک کے لیے دستور بنانے کی آئینی اور اخلاقی حیثیت سے مجاز تھی۔

سنہ ۱۹۴۷ء میں دستور سازی کے لیے جو مجلس بنی تھی اس نے ۱۹۵۴ء میں دستور کی تکمیل کر دی تھی اور وہ ۲۵ دسمبر ۱۹۵۴ء کی تاریخ بھی اس کے نفاذ کے لیے مقرر کر چکی تھی۔ مگر یہ سب کچھ ہو جانے کے بعد اُس زمانے کے گورنر جنرل نے اکتوبر ۱۹۵۴ء میں اس مجلسِ دستور ساز کو توڑ دیا اور اس کا بنایا ہوا دستور رکھا رہ گیا۔ اگرچہ بعد میں فیڈرل کورٹ نے یہ فیصلہ دے دیا کہ گورنر جنرل کا یہ فعل قانوناً صحیح تھا اور ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے کہ اب اس فیصلے کو قانونی اغراض کی حد تک تسلیم کریں، لیکن ہمیں یہ کہنے کا حق ہے کہ عدالت کا وہ فیصلہ صحیح نہ تھا۔ وہ گورنر جنرل اُس تاجِ برطانیہ کے نمائندے کی حیثیت سے اِس منصب پر مقرر ہوا تھا جو حاکمیت کے اختیارات سے دستبردار ہو چکا تھا۔ حاکمیت کی حامل اس وقت دستور ساز اسمبلی تھی نہ کہ گورنر جنرل۔ اس لیے ایک صاحبِ حاکمیت ادارے کو وہ شخص جو حاکمیت کا حامل نہ تھا توڑنے کا کوئی حق نہ رکھتا تھا۔ وہ نہ تاجِ برطانیہ کے نمائندے کی حیثیت سے اس کا مجاز تھا نہ اُس کو کسی درجے میں بھی قوم کی نمائندگی کے حقوق و اختیارات حاصل تھے، نہ تاجِ برطانیہ یا جمہورِ قوم میں سے کسی نے اس سے یہ کہا تھا کہ وہ دستور ساز اسمبلی توڑ دے اور اس کا بنایا ہوا دستور ردّی کی ٹوکری میں ڈال دے۔ اس نے سراسر اپنی شخصی حیثیت میں اس فعل کا ارتکاب کیا تھا۔ اور اس ارتکاب میں وہ صرف اس وجہ سے کامیاب ہو گیا کہ حکومت کا نظم و نسق چلانا جن ملازمین کے ہاتھ میں تھا انہوں نے دستور اور جمہور اور پارلیمنٹ کے ساتھ وفاداری کرنے کے بجائے ایک شخص کے ساتھ وفاداری کی ۔۔۔ اگر وہ قوم اور اس کی جمہوریت اور

دستورِ مملکت کے وفادار ہوتے تو دستور ساز اسمبلی ٹوٹنے کے بجائے گورنر جنرل اپنے منصب سے رخصت ہو جاتا۔

اس کے بعد فیڈرل کورٹ کے فیصلے کے مطابق ایک نئی دستور ساز اسمبلی بنی، جسے قانونی طور پر حاکمیت کے آئینی اختیارات حاصل ہوتے تھے۔ اس نے یہ اختیارات استعمال کر کے ۱۹۵۶ء کا دستور بنایا اور یہ دستور عملاً نافذ بھی ہو گیا۔ پھر ۱۹۵۸ء کے وسط میں انتخابات عام کے لیے فروری ۱۹۵۹ء کی تاریخ بھی مقرر کر دی گئی تاکہ عوام اپنے نمائندے منتخب کر کے عملاً حاکمانہ اختیارات کا استعمال شروع کر دیں۔ مگر یہ سب کچھ ہو چکنے کے بعد اکتوبر ۱۹۵۸ء کی ایک رات کو یکایک دستور منسوخ کر دیا گیا، پارلیمنٹ توڑ دی گئی اور ملک میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔ اس دستور کو جس شخص نے توڑا وہ دستور کا بنانے والا نہیں بلکہ دستور کا بنایا ہوا صدر تھا۔ وہ نہ دستور کو منسوخ کرنے کا مجاز تھا، نہ دستور کی منسوخی کے بعد اس کی کوئی حیثیت باقی رہ جاتی تھی جس کی بنا پر وہ ملک میں حکمرانی کے اختیارات استعمال کر سکے۔ اس کو دستور سے باہر جا کر حکومت کی مشینری چلانے والے ملازمین کو احکام دینے کا سرے سے کوئی حق حاصل نہ تھا اور نہ ملازمین کے لیے کسی طرح یہ جائز تھا کہ وہ اس کے کسی غیر دستوری حکم کی تعمیل کریں۔ لیکن یہاں پھر وہی صورت پیش آئی جو ۱۹۵۴ء میں پیش آئی تھی کہ سرکاری ملازمین نے دستور اور جمہور اور پارلیمنٹ، یا بالفاظ دیگر قوم اور ریاست کی وفاداری کے بجائے ایک شخص کے ساتھ وفاداری کی۔ اسی وجہ سے اس شخص کا یہ فرمان نافذ ہو گیا کہ دستور ختم، پارلیمنٹ برخاست، اور ملک پر مارشل لاء مسلط۔ اگر یہ صورت نہ ہوتی تو دستور کے بجائے اس شخص کی صدارت ختم ہو جاتی جس نے دستور و قانون کے دائرہ سے باہر جا کر اختیارات استعمال کرنے کی جسارت کی تھی۔

اس کے بعد مارشل لاء کے زمانے میں چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر نے بنیادی جمہوریتوں کے اسّی ہزار نمائندوں سے یہ اختیارات طلب کیے کہ وہ ملک کے لیے جو دستور چاہیں بنا دیں۔ یہ

بات پیش نظر رکھیے کہ یہ اختیارات مارشل لاء کے زمانے میں مانگے گئے تھے، چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر نے مانگے تھے اور ان کو طلب کرتے وقت کوئی متبادل صورت نہیں رکھی گئی تھی کہ اگر لوگ یہ طلب کردہ اختیارات نہ دیں تو دوسرا چارۂ کار کیا ہے۔ بظاہر ہر شخص یہی سمجھتا تھا کہ اس مطالبے کے حق میں ووٹ نہ دینے کے معنی یہ ہوں گے کہ ملک پر ہمیشہ مارشل لا مسلط رہے گا اور اس ملک کو کبھی دستور نصیب نہ ہوگا۔ ان حالات میں جو اختیارات دیئے گئے ان کی اخلاقی حیثیت بیان کرنے کی حاجت نہیں ہے۔ عقل اور انصاف کی حس رکھنے والا ہر انسان خود سمجھ سکتا ہے کہ ان کی حیثیت کیا ہے۔

پھر یہ اختیارات حاصل کر لینے کے بعد کسی شخص کو دستور کے مسئلہ پر زبان کھولنے کا حق نہیں دیا گیا۔ ایک فرد واحد نے ملک کا دستور بنایا اور اس دستور کے عملاً نافذ ہو جانے تک پوری قوم کی زبان بند رکھی گئی۔

یہ تاریخی پس منظر اس حقیقت کو بالکل واضح کر دیتا ہے کہ سابق دستور کا منسوخ ہونا اور موجودہ دستور کا آئین مملکت قرار پا جانا اس بنا پر ایک امر واقعہ تو ضرور ہے کہ طاقت کے ذریعے یہ دونوں کام انجام پا چکے ہیں۔ لیکن کسی شخص کو بھی یہ امید نہ رکھنی چاہیے کہ قوم کا ضمیر اس امر واقعہ کو امر جائز کی حیثیت سے بھی تسلیم کرے گا۔ سارے واقعات دن کی روشنی میں سب کے سامنے گزرے ہیں۔ لوگوں نے کھلی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا ہے۔ لوگ نہ اپنی آنکھوں کو جھٹلا سکتے ہیں اور نہ عقل و فہم سے عاری ہیں کہ ان واقعات کے معنی نہ سمجھ سکتے ہوں۔

اب اصل دستور کی طرف آیئے۔ اس کے آغاز ہی میں یہ بات صاف صاف لکھی ہوئی ہمیں ملتی ہے کہ یہ دستور فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں صاحب نے پاکستان کے لیے بنایا ہے۔ کسی قوم کی عزت و آبرو کے لیے بجائے خود یہ بات ہی کچھ کم غارت گر نہیں ہے کہ قوم نے خود اپنے لیے دستور نہیں بنایا ہے بلکہ ایک فیلڈ مارشل نے اس کو دستور عطا کیا ہے۔ اگرچہ اس کے ساتھ یہ ضرور کہا گیا ہے کہ قوم کے دیئے ہوئے اختیارات کی بنا پر انہوں نے یہ دستور بنایا ہے لیکن آخر

دنیا اندھی اور بہری تو نہیں ہے۔ کس کو معلوم نہیں ہے کہ یہ اختیارات کن حالات میں کس طرح لیے گئے تھے؟ کس سے یہ بات چھپی ہوئی ہے کہ یہ دیے ہوئے اختیارات نہ تھے بلکہ لیے ہوئے اختیارات تھے؟ کون نہیں جانتا کہ جس قوم سے یہ اختیارات لیے گئے تھے اس کو آخر وقت تک دستور کے مسئلے میں زبان کھولنے کا حق نہیں دیا گیا؟

اس دستور کی قدر و قیمت کا صحیح طور پر اندازہ کرنے کے لیے ہمیں اسے دو پہلوؤں سے جانچنا چاہیے۔ ایک اسلامی پہلو اور دوسرے جمہوری پہلو۔ اسلامی پہلو سے یہ دستور انتہائی مایوس کن ہے اور ملت کی دلی آرزوؤں اور تمناؤں کی کسی طرح بھی ترجمانی نہیں کرتا۔

سب سے پہلے مملکت کا نام نئے دستور میں "اسلامی جمہوریہ پاکستان" کے بجائے صرف جمہوریہ پاکستان رکھا گیا ہے۔ اگرچہ اب یہ اعلان ہوا ہے کہ اس غلطی کی تلافی نئی دستوری ترمیم سے کر دی جائے گی لیکن اوّل تو یہ بات قابلِ غور ہے کہ جو نام ایک دفعہ رکھا جا چکا تھا اس میں سے لفظ "اسلامی" نکالنے کی آخر کیا وجہ تھی۔ پہلے یہ نام نہ ہوتا تو بات نگاہوں میں اس قدر نہ کھٹکتی مگر جب اثبات کے بعد نفی کی جائے تو لامحالہ دلوں میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس نفی کے پیچھے کیا محرکات کام کر رہے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اب اس غلطی کی تلافی کی بھی جا رہی ہے تو بے محابا یہ کہہ کر کی جا رہی ہے کہ عوام کی رائے کا لحاظ کر کے ایسا نہیں کیا جا رہا ہے بلکہ حکمراں گروہ خود ایسا کرنا مناسب سمجھتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں حکمراں گروہ اب یہاں اس ذہنیت کے ساتھ حکمرانی کر رہا ہے کہ قوم اور اس کی رائے اس کے نزدیک کوئی وزن نہیں رکھتی اور اس کا لحاظ کرنا حکمرانوں کی نگاہ میں ایک کمزوری ہے۔

اس کے بعد دستور میں یہ کہا گیا ہے کہ اسلام کے خلاف کوئی قانون نہ ہونا چاہیے۔ سابق دستور میں "اسلام" کے بجائے "قرآن و سنت" کے الفاظ استعمال کیے گئے تھے، مگر اس دستور میں نہ صرف ایک جگہ بلکہ ہر جگہ قرآن و سنت کے الفاظ کو چھوڑ کر لفظِ اسلام استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اسلام کے معتبر اور مسلّم مآخذ سے اجتناب کر کے کوئی خاص

اسلام یا اس کی کوئی خاص تعبیر نافذ کرنا پیش نظر ہے۔ ورنہ آخر کیا معقول وجہ ہے کہ قرآن و سنت کی تصریح سے ہر جگہ اجتناب کیا گیا ہے؟ اس اجتناب کو دانستہ میں اس بنا پر کہنے پر مجبور ہوں کہ سابق دستور میں کتاب و سنت کی تصریح تھی اور اس دستور میں ان تمام مقامات پر ان کو چھوڑ کر صرف اسلام کا لفظ رکھ دیا گیا ہے۔ آخر ہم یہ کیسے مان لیں کہ یہ تغیر بے وجہ ہے۔

پھر یہ کہنا کہ اسلام کے خلاف کوئی قانون نہ ہونا چاہیے ایک مضحکہ بات ہے۔ ایک حکومت جس کو وہ لوگ چلا رہے ہوں جو خدا اور رسول پر ایمان رکھتے ہوں، محض اس بات کی پابند نہیں ہوتی کہ اسلام کے خلاف کام نہ کرے، بلکہ وہ اس بات کی بھی پابند ہوتی ہے کہ اسلامی احکام کو نافذ کرے، جن چیزوں کو اسلام حرام کرتا ہے ان کو روکے اور انسانیت کی اصلاح کے لیے جو اسکیم اسلام نے دی ہے اس کو عمل میں لائے۔

سابق دستور میں فیصلہ کیا گیا تھا کہ پہلے سے جو غیر اسلامی قوانین چلے آرہے ہیں ان کو کتاب و سنت کے مطابق تبدیل کیا جائے گا۔ لیکن یہ دستور سابق قوانین کے بارے میں خاموش ہے۔

سابق دستور میں حکومت کی یہ ذمہ داری قرار دی گئی تھی کہ وہ قحبہ گری، شراب اور قمار بازی کو بند کرے گی۔ اس دستور میں ان چیزوں کی صرف حوصلہ شکنی (DISCOURAGE) کرنے کا ذکر کیا گیا ہے۔ شاید اس کا مطلب یہ ہو کہ زنا کاری کے اڈوں پر لائسنس فیس بڑھا دی جائے گی، شراب کی قیمت میں اضافہ کر دیا جائے گا، اور قمار بازی صرف کلبوں اور ریس کورس میں ہو سکے گی!

سابق دستور میں یہ کہا گیا تھا کہ "ربا" کا سدباب کیا جائے گا اور لفظ ربا کی کوئی تشریح نہیں کی گئی تھی۔ اس دستور میں لفظ ربا کے آگے قوسین میں یوژری (USURY) بڑھا دیا گیا ہے۔ اگرچہ لغت کے لحاظ سے لفظ انٹرسٹ اور یوژری دونوں سود اور ربا کے ہم معنی ہیں لیکن اب اصطلاح عام میں یوژری کا لفظ بچھانوں اور مہاجنوں کی حد سے بڑھی ہوئی شرح سود کے لیے

استعمال کیا جاتا ہے اور صرف اسی کو بند کرنا غالباً دستور ساز کے پیش نظر ہے۔ ربا کی تشریح میں انٹرسٹ کے بجائے یوزری کا لفظ لکھنے کی کوئی دوسری وجہ ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔

اس بات کا انتظام کرنے کے لیے کہ اسلام کے خلاف کوئی قانون سازی نہ ہو ایک مشاورتی کونسل دستور میں تجویز کی گئی ہے جسے نامزد کرنا صدر کے اختیار میں ہے۔ اس بظاہر مبارک تجویز کے پیچھے جو ارادہ کام کر رہا ہے اس کا اندازہ اُن اصحاب سے ہوتا ہے جن پر اس کونسل کی رکنیت کے لیے نگاہِ انتخاب پڑی ہے۔ اس انتخاب نے ایک خود بینی اقلیت کو چھوڑ کر پوری قوم کو اس طرف سے مایوس کر دیا ہے کہ اس کونسل کی مدد سے اسلام کے خلاف کسی قانون سازی کا سدباب ہو سکے گا۔ بلکہ اس امر کا سخت اندیشہ پیدا ہو گیا ہے کہ اب ہمیں اسلام کی نئی اور نرالی تعبیرات سے سابقہ پیش آئے گا۔

آئیے اب ذرا ہم جمہوریت کے نقطۂ نظر سے اس دستور کا جائزہ لیں۔ علم سیاست کی رُو سے ریاست کے تین بنیادی اجزاء ہوتے ہیں ایک انتظامیہ، دوسرے مقننہ اور تیسرے عدلیہ۔ اس دستور میں انتظامیہ کے جملہ اختیارات صدر کے سپرد کیے گئے ہیں اور اُن پر کسی نوعیت کی کوئی قدغن نہیں ہے۔ عدلیہ کو باشندوں کے بنیادی حقوق کی حفاظت کے اختیارات سے عملاً بے دخل کر دیا گیا ہے اور اب بظاہر اشک شوئی کے لیے بنیادی حقوق کے متعلق جو نئی دستوری ترمیم حکومت کی طرف سے آ رہی ہے اس میں مارشل لا کے دور کے قوانین کو مستثنیٰ کر کے پوری ترمیم کو بے معنی بنا دیا گیا ہے۔ اس کے بعد ریاست کا تیسرا جزء رہ جاتا ہے، یعنی مقننہ اس کے اختیارات کو طرح طرح سے محدود کر کے قانون سازی کی طاقت بھی درحقیقت اسی ہستی کی طرف منتقل کر دی گئی ہے جس کو انتظامیہ کے مکمل اختیارات دیئے گئے ہیں۔ یہ بات دستور کی حسب ذیل شقوں سے صاف طور پر ظاہر ہوتی ہے۔

۱۔ صدر کے خلاف مذمت کی قرارداد، یا اس کو ذہنی اور جسمانی حیثیت سے نااہل قرار دینے کی تحریک کے متعلق دستور میں یہ طے کیا گیا ہے کہ اگر ایسی کسی تحریک کے حق میں ووٹ دینے

والے ارکان اسمبلی کی تعداد اس کے کُل ارکان کی نصف تعداد سے کم ہو تو تحریک کے پیش کرنے والے ارکان آپ سے آپ اسمبلی کی رکنیت سے خارج ہو جائیں گے۔ جمہوری دستوروں میں یہ دفعہ بے نظیر ہے اور اس کی موجودگی میں مشکل ہی سے کبھی ایسی کوئی قرارداد یا تحریک لانے کی کوئی شخص جرأت کر سکتا ہے۔

۲۔ احتیاطی نظر بندی کے متعلق کوئی مسودۂ قانون یا کوئی ترمیم صدر کی پیشگی منظوری کے بغیر سرے سے مجلسِ قانون ساز میں لائی ہی نہیں جا سکتی۔

۳۔ بجٹ اور مالی مسوداتِ قانون کے بارے میں اسمبلی کے اختیارات اس قدر محدود کر دیئے گئے ہیں کہ مالیات کا بہت بڑا حصہ اس کے دائرۂ اختیارات سے خارج ہو جاتا ہے۔

۴۔ قانون سازی کے معاملہ میں یہ عجیب و غریب طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ اگر اسمبلی کے پاس کیے ہوئے کسی قانون کو صدر منظور نہ کرے اور اسمبلی دوبارہ اس قانون کو کل ارکان کی ۲/۳ اکثریت سے پاس کر دے تب بھی صدر اس کی منظوری دینے کا پابند نہیں ہے۔ بلکہ اس پر بنیادی جمہوریتوں کے ممبروں سے استصواب کرایا جائے گا اور کل ممبروں کی نصف سے زائد تعداد جب اس کے حق میں ووٹ دے گی تب کہیں وہ قانون پاس ہو سکے گا۔

۵۔ صدر کے جاری کردہ آرڈی ننسوں کے بارے میں اسمبلی کو صرف انہیں منظور یا نامنظور کرنے کے اختیارات ہیں، ان میں کسی ترمیم کے اختیارات نہیں ہیں۔ اور ستم ظریفی یہ ہے کہ مارشل لا کے زمانے کے تمام آرڈی ننس، جن کے ذریعے سے انتظامیہ کو بے تحاشا اختیارات دیئے گئے تھے، اس دستور کی رُو سے آپ سے آپ قانون قرار پا گئے ہیں۔

۶۔ سب سے زیادہ عجیب و غریب طریقِ کار ترمیمِ دستور کے معاملے میں اختیار کیا گیا ہے۔ اگر اسمبلی کے کل ممبروں کی ۲/۳ تعداد دستور میں کوئی ترمیم پاس کر دے تو اسے صدر کے سامنے منظوری کے لیے پیش کیا جائے گا۔ صدر اگر اس کی منظوری نہ دے تو پھر اس کو پاس کرنے کے لیے کل ممبروں کی ۳/۴ تعداد درکار ہوگی۔ مگر پھر بھی صدر اس کی منظوری دینے کا پابند نہیں ہے۔ اگر صدر

اس کو منظور نہ کرے تو تیسری مرتبہ اسمبلی کو ۲/۳ اور بعض حالات میں ۳/۴ اکثریت سے پھر اسے پاس کرنا ہوگا۔ اس پر بھی اگر صدر اس کو منظور نہ کرے تو اس پر بنیادی جمہوریتوں کے ممبروں سے ریفرنڈم کرایا جائے گا اور اس میں اگر اُن کی کل تعداد کا نصف سے زائد حصہ اس ترمیم کے حق میں ووٹ دے تب کہیں وہ ترمیم قانون کی شکل اختیار کرے گی۔

اس طرح مجلسِ قانون ساز کے اختیارات کو ہر طرف سے محدود کرنے کے بعد بھی یہ ضرورت محسوس کی گئی کہ وزیروں اور پارلیمنٹری سیکرٹریوں کا ایک لشکر مجلس قانون ساز میں داخل کیا جائے تاکہ اسمبلی میں کم از کم اتنی تعداد صدر کے منشا کی پیروی کرنے والے ارکان کی موجود رہے جو کبھی کوئی قانون یا ترمیم دستور کا کوئی مسودہ صدر کی مرضی کے خلاف پاس نہ ہونے دے۔

کیا اس دستور کو کسی معنی میں بھی ایک جمہوری دستور کہا جا سکتا ہے؟ دراصل یہ نہ پارلیمانی جمہوریت ہے اور نہ صدارتی جمہوریت۔ یہ جمہوریت کے نام سے ایک آمریت ہے جو اس دستور کے ذریعے سے اس ملک میں قائم کی گئی ہے۔

اس ضمن میں یہ حقیقت پوری طرح ذہن نشین رہے کہ اس دستور میں عوام کو جس طریقہ سے بنیادی حقوق سے محروم کیا گیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا مشکل ہے کہ باشندگانِ ملک آزادی سے متمتع ہو رہے ہیں۔ دراصل اب ہماری آزادی صرف ہمارے حکمرانوں کی آزادی ہے۔ نو کروڑ باشندگانِ ملک کی آزادی نہیں ہے۔ جن حقوق کو حاصل کرنے کے ذرائع سے لوگ محروم کر دیئے جائیں ان کو محض کاغذ پر لکھ دینا مقدس خواہشات سے بڑھ کر کیا قدر و قیمت رکھتا ہے۔

آخر میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے مولانا نے فرمایا کہ جمہوریت کی دو شکلیں دنیا میں مسلّم ہیں۔ ایک پارلیمانی اور دوسرے صدارتی۔ اگر صدارتی طرز کی جمہوریت یہاں نافذ ہو تو اس کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ جمہوریت نہ ہوگی۔ لیکن جو شخص بھی ہمارے ملک کے حالات پر نگاہ ڈالے گا اور ان دونوں طرز کی جمہوریتوں کے تجربات پر نگاہ رکھے گا وہ یہ مانتے میں

تامل نہ کرے گا کہ ہمارا ملک صدارتی جمہوریت کی عیاشی برداشت کرنے کے قابل نہیں ہے۔ پارلیمانی جمہوریت میں جو پارٹی پارلیمنٹ کے اندر اکثریت رکھتی ہو وہی انتظامی اختیارات کی حامل ہوتی ہے اور اسے پارلیمنٹ میں اپنے ان اختیارات کے متعلق جوابدہی کرنی پڑتی ہے۔ اگر وہ پارلیمنٹ کے ارکان کی اکثریت کو مطمئن نہ کر سکے تو حکومت کے اختیارات اس کے ہاتھ میں نہیں رہ سکتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پارلیمانی جمہوریت میں حکمران پارٹی کے ارکان کبھی اُس حد تک ناجائز فائدے نہیں اٹھا سکتے جس کی نظیریں صدارتی جمہوریت میں مجلسِ قانون ساز کے ارکان پیش کرتے ہیں۔ اس کے برعکس چونکہ صدارتی جمہوریت میں انتظامیہ کو قانون سازی اور بجٹ کے معاملے میں مجلس قانون ساز پر انحصار کرنا پڑتا ہے اس لیے وہ مجلسِ قانون ساز کے ارکان کو راضی رکھنے کے لیے بے تحاشا رشوتیں دینے پر مجبور ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ کرنے کے لیے صرف یہ بات کافی ہے کہ ایک طرف ہمارے سامنے برطانوی پارلیمنٹ ہے جس کے ارکان کو ایک ہزار پاؤنڈ فی کس سالانہ الاؤنس ملتا ہے اور سات سو پچاس پاؤنڈ سالانہ اُن مصارف کے لیے دیئے جاتے ہیں جو پارلیمنٹ کے رُکن ہونے کی حیثیت سے انھیں کرنے ہوتے ہیں۔ دوسری طرف صدارتی جمہوریت کی بہترین مثال امریکی کانگریس ہے جس کے ہر رکن پر تقریباً ۹۰ ہزار پاؤنڈ سالانہ خرچ ہوتے ہیں۔ دوسرے تمام پہلوؤں کو چھوڑ کر صرف مالی حیثیت سے ہی دیکھ لیا جائے تو کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ ہمارا ملک جمہوریت کی صدارتی شکل کو برداشت کرنے کے قابل ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ایک بگڑے ہوئے پارلیمانی نظام میں بھی حکمراں پارٹی اپنی اکثریت برقرار رکھنے کے لیے ممبروں کو سیاسی رشوتیں دیتی ہے جس کی بدترین نظیریں ہماری آنکھیں دیکھ چکی ہیں۔ لیکن صدارتی نظام چلانے کے لیے جو رشوتیں دی جاتی ہیں ان سے پارلیمانی نظام کی رشوتوں کو کوئی نسبت نہیں ہے۔